قسط ۲

اسلام اور مغرب

محمد عطاء اللہ صدیقی

سیکولرزم کا سرطان

ازم کی خانہ زاد، خود ساختہ اور ساقط الاعتبار وضاحت کو کس منطق کے مطابق قبول کریں۔ اور پھر ایما ڈنکن اور وہ صاحب جنہوں نے اسے بتایا کہ اُردو زبان میں مذہبی طبقہ نے سیکولرزم کے لئے 'لادینیت' کی اصطلاح کو رواج دیا، اگر ذرا سا غور کریں تو انہیں اس سطحی الزام تراشی پر خود ہی شرم محسوس ہونے لگے گی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب جیسے اُردو زبان و ادب کے عظیم دانشور، جو فکری اعتبار سے سیکولر ہیں، اگر اپنی مرتب کردہ لغت میں سیکولر ازم کے لئے ''لادینی جذبہ'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، تو پھر مذہبی طبقہ کو مطعون کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا کوئی سیکولر دانشور یہ فرض کرسکتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب جیسا لسانیات کا بحرِ خار اس معاملہ میں کسی غیر ذمہ دارانہ اور غیر ثقہ ترجمہ کو پیش کرسکتا ہے۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ اُردو زبان میں سیکولر ازم کا مترادف موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیرِ نگرانی مرتب کئے جانے والے ''اردو معارفِ اسلامیہ'' جو پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا (۱۹۷۲ء) کی جلد ۹ صفحہ ۴۴۶ پر سیکولر ازم کا ترجمہ ''دُنیویت'' کیا گیا ہے۔ انگریزی لغات میں سیکولر ازم کی درج شدہ چند وضاحتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ''دنیویت'' بھی بہت مناسب مترادف معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص "Worldliness" کا یہی ترجمہ ہی مناسب ہے۔ عالم اسلام کے نامور مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جن کی عربی اور اردو زبان میں تصنیفات کا ایک زمانہ معترف ہے، انہوں نے اپنی تحریروں میں سیکولر ازم کے لئے ''نامذہبیت'' کا مترادف استعمال کیا ہے۔ ان کی معروف تصنیف ''عالم اسلام میں مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش'' میں متعدد مقامات پر ''نامذہبیت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں انہوں نے ''لادینیت'' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زبان و ادب کے اتنے بڑے شاہ سوار اور مایہ ناز ادیب نے ''نامذہبیت'' اور ''لادینیت'' کے الفاظ کیا محض تہذیبِ مغرب کے خلاف کسی تعصب کی بنا پر استعمال کئے ہیں؟ سید ابوالحسن علی ندوی کے متعلق اس طرح کا سوئے ظن کوئی بہت بڑا بد باطن ہی پال سکتا ہے۔

عربی زبان میں سیکولر ازم کا مترادف: عربی زبان اُردو زبان کا بہت بڑا سرچشمہ ہے۔ اردو زبان کے ہزاروں خوبصورت الفاظ اور تراکیب کا اصل منبع و مصدر عربی زبان ہی ہے۔ امتِ مسلمہ کا عظیم ترین لٹریچر بھی اسی مقدس زبان میں موجود ہے جس میں ''قرآنِ عربی'' نازل فرمایا گیا۔ عربی زبان کی فصاحت ضربُ المثل ہے۔ عالم عرب کے معروف سیکولر دانشور سیکولر ازم کا ترجمہ العلمانیۃ کرتے ہیں۔ ان میں سے بھی کسی نے اس کا ترجمہ 'مذہبی غیر جانبداری' نہیں کیا۔ مگر عربی زبان کے دین پسند دانشوروں نے عرب سیکولر طبقہ کی جانب سے سیکولر ازم کے لئے 'علمانیت' کے مترادف کو غلط قرار دیا ہے۔ عالم عرب کے

شہرۂ آفاق مصنف علامہ یوسف قرضاوی نے اپنی کتاب ''سیکولرازم اور اسلام'' میں سیکولرازم کے معانی و مطالب پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب دیکھنا یہ ہے کہ 'سیکولرزم' کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے لئے عربی زبان میں 'علمانیت' کا لفظ مستعمل ہے جو کہ انگریزی Secularism ،فرانسیسی Secularite کا ترجمہ ہے۔ مگر یہ ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ لفظ علم یا اس کے مشتقات کا سیکولرزم سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ علم کا مترادف انگریزی اور فرانسیسی میں Science ہے جو مسلک یا فکر سائنس کی جانب منسوب ہوا، اسے Scientism کہا جاتا ہے اور علم کی جانب انگریزی میں نسبت ہو تو انگریزی میں اسے Scientific کہا جاتا ہے''

وہ اس موضوع پر علمی بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''بہرحال سیکولرزم کا صحیح ترجمہ 'لادینی' یا 'دنیاوی' ہے۔ دنیاوی نہ صرف اُن معنوں میں کہ یہ اُخروی کے بالمقابل ہے بلکہ ان مخصوص معنوں میں کہ ایسا دنیاوی رویہ جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو یا اگر کوئی تعلق ہو تو یہ تعلق تضاد کا تعلق ہو۔ عربی زبان میں سیکولرازم کا ترجمہ ''علمانیت'' اس لئے کیا گیا ہے کہ ترجمہ کرنے والے 'دین' اور 'علم' کا وہی مفہوم سمجھتے ہیں جو ان الفاظ کا مسیحی دنیا میں سمجھا جاتا ہے۔ مغرب میں دین اور علم دو متضاد الفاظ ہیں یعنی ان کے یہاں جو بات دینی یا مذہبی ہو وہ علمی نہیں ہوسکتی اور علمی بات دینی نہیں ہوسکتی۔ غرض ان کے یہاں علم اور عقل دین کے بالمقابل اور اس کی ضد ہیں اور اسی طرح 'علمانیۃ' اور 'عقلانیت' ایسے رویے ہیں جو دین کے برعکس ہیں'' (صفحات: ۴۹۔۵۱)

مشہور مستشرق آربری اپنی کتاب ''مشرقِ وسطیٰ میں مذہب'' میں لکھتا ہے:

''مادّی علمیت، انسانیت، طبعی مذہب اور وضعیت سب لادینیت (سیکولرازم) کی صورتیں ہیں اور لادینیت یورپ اور امریکہ کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اگرچہ یہ مظاہر مشرقِ اوسط میں بھی موجود ہیں لیکن انہیں کوئی فلسفیانہ رُخ یا متعین اَدبی رخ نہیں ملا۔ اس کا حقیقی نمونہ جمہوریہ ترکیہ میں مذہب وحکومت کی تفریق ہے''

پاکستان کے سیکولر دانشور سیکولرازم کا ترجمہ ''مذہبی غیر جانبداری'' اگر بتلاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ لغوی اور اصطلاحی اعتبار سے یا عملی اعتبار سے سیکولر ریاست غیر جانبدار ہوتی ہے۔ وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں کسی ''لادینی'' یا ''غیر مذہبی'' ریاست کا اس جرات مندی سے مطالبہ کرنا ممکن نہیں ہے جس طرح کہ یورپ میں۔ یہاں اس طرح کے مطالبہ کو نہ صرف مسترد کردیا جائے گا بلکہ اس کے خلاف شدید ردّعمل بھی سامنے آسکتا ہے، اسی لئے وہ اسلام کی کھلم کھلا مخالفت کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ وہ نظریاتی طور پر 'لادین' ہی ہیں مگر اپنے نظریے سے ان کی وابستگی اتنی شدید نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کرسکیں۔ عالم اسلام میں ترکی سیکولر ریاست کی نمایاں ترین مثال ہے۔ وہاں جس 'غیر جانبداری' کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اس کی داستانیں زبان زدِ عام ہیں۔ اس نام نہاد غیر جانبدار (سیکولر)

ریاست میں ایک خاتون رکن پارلیمنٹ کو محض اس لئے برداشت نہیں کیا جاتا کہ اس نے سر پر سکارف اوڑھ رکھا ہے۔ گذشتہ سال ترکی پارلیمنٹ کی خاتون رکن محترمہ مَروۃ کی اسمبلی کی رُکنیت اس 'جرم' کی پاداش میں منسوخ کردی گئی اور ان کی شہریت ختم کردی گئی۔ وہ اب دربدری کا دکھ سہہ رہی ہیں۔ سیکولر ازم کا اگر مزید مفہوم سمجھنا ہو تو پاکستان کے مادر پدر آزاد دانشوروں اور صحافیوں کی تحریریں پڑھ لی جائیں۔ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جو شدید نفرت اور حقارت ان کی تحریروں میں ملتی ہے، وہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ سیکولرازم کا جو مفہوم ان کے اپنے ذہنوں میں ہے اس کے لئے ''لادینیت'' بلکہ بعض انتہا پسند افراد کی صورت میں ''دہریت'' کے الفاظ ہی صحیح مترادفات ہیں۔

سیکولرزم کے حامیوں کے دوہرے معیار

پاکستان کے ایک سیکولر دانشور عزیز صدیقی صاحب جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

''ہر ملک کے آئین میں اس امر کا اعلان واشگاف طور پر ہونا چاہئے کہ اس کے تمام شہری اور مذہبی، نسلی اور لسانی گروہ قانون کی نظر میں برابر ہیں اور انہیں برابر کی سطح پر اور پوری آزادی کے ساتھ ہم آہنگی کے ماحول میں ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ریاست کو لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے سیکولر ہونا پڑے گا۔ ایک بے عمل ریاست کے بعد بدترین منافرت پیدا کرنے والی ریاست وہ ہے جو اپنے عمل میں جانبدار ہے اور جو حکومت غیر سیکولر ہے وہ صریحاً جانبدار ہے۔ چنانچہ ریاست کی یہ ذمہ داری ہونی چاہئے کہ وہ علم، آگہی اور معقولیت کا ایسا ماحول پیدا کرے جس میں عصبیت پر مبنی اُصول اور تشدد کے حربے بالعموم ناپسند کئے جانے لگیں''
(پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری: مرتب حسن عابدی، صفحہ نمبر ۶۴)

عزیز صدیقی صاحب جن معنوں میں سیکولر ریاست کو غیر جانبدار سمجھتے ہیں، ان معنوں میں ایک اسلامی ریاست بھی غیر جانبدار ہوتی ہے۔ اس میں قانون کی حکمرانی کا وہی تصور موجود ہے لیکن عملی حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ نہ تو سیکولر ریاست کلیۃً غیر جانبدار ہوتی ہے اور نہ ہی اسلامی ریاست۔ چونکہ دونوں ریاستوں کے پس پشت ایک بے حد توانا نظریہ کارفرما ہوتا ہے، اسی لئے دونوں ریاستیں ہی درحقیقت نظریاتی ریاستیں ہوتی ہیں۔ اور ایک نظریاتی ریاست کبھی بھی مکمل غیر جانبدار نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اسے ہونا چاہئے۔ ایک اسلامی ریاست اسلام کی نظریاتی اُساس سے متصادم سرگرمیوں کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کرے گی۔ ایک سیکولر ریاست اپنے شہریوں کو ساحل پر فطری لباس (ننگا پن) میں گھومنے کی تو بخوشی اجازت دے دیتی ہے، مگر یہی ریاست سکول کی بچیوں کے سر پر سکارف اوڑھنے کی اجازت نہیں دیتی، فرانس اور مصر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ترکی کی سیکولر ریاست شہوت انگیز موسیقی کی کھلم کھلا اجازت دیتی ہے، مگر وہ مساجد میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اذان دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہاں کے تعلیمی اداروں میں مذہب دشمن مضامین پڑھائے جاتے ہیں مگر دین کی تعلیم کی اجازت نہیں ہے۔ اور پھر

ہمارے ہاں عزیز صدیقی صاحب جیسے سیکولر دانشور جو علم، آگہی اور عقلیت سے بھرپور مگر عصبیت سے خالی معاشرہ کا قیام چاہتے ہیں، وہ دینی مدارس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہاں ان کی 'روا داری' ایک عجیب تنگ نظری میں بدل جاتی ہے۔ وہ علم سے مراد صرف دنیاوی علوم لیتے ہیں۔ اگر عوام اپنی مرضی سے دینی علوم کا اہتمام کرنا چاہیں تو یہ اسے برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ المختصر سیکولر ریاست کی ''غیر جانبداری اور عدم مداخلت'' ایک ڈھونگ اور لایعنی دعویٰ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فحاشی اور عریانی کے خاتمے کے لئے ریاستی مداخلت زیادہ قابل قبول ہے یا دینی مدارس کو ختم کرنے یا اسکارف پر پابندی لگانے کے لئے ریاستی مداخلت زیادہ بہتر ہے۔ اس بات کا فیصلہ ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان خود کرسکتا ہے۔

اسلام اور سیکولرزم میں مشترک قدریں ڈھونڈنے کی کوشش

ہمارے ہاں ایک مخصوص طبقہ جو مذہب سے مکمل انکار نہیں کرتا، اسلام اور سیکولرازم کے درمیان عجب مشابہت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ چونکہ سیکولرازم کا ایک پہلو دنیوی اُمور کی انجام دہی بھی ہے اور اسلام دین و دنیا کی تفریق کا قائل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ حضرات 'دنیا داری' کو اسلام اور سیکولرازم کے درمیانی قدرِ مشترک قرار دے کر اسلام اور سیکولرازم کے درمیان فرق کو مٹا دینا چاہتے ہیں اور پھر اس استدلال کے ذریعے بزعم خویش ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست ہی سیکولر ریاست ہے۔

روزنامہ ڈان (۲۵ر جون ۲۰۰۰ء) میں کراچی کے پروفیسر سید جمیل واسطی کا ایک مفصل مکتوب، ''اسلام اور سیکولرازم'' کے عنوان سے چھپا ہے۔ موصوف رقم طراز ہیں:

> ''لفظ 'سیکولر' کا 'لادینی' ترجمہ کرنا درحقیقت اس لفظ کے اصل مطلب کو مسخ کرنے اور اس کی اہمیت کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ اس لفظ کو اس کے اصل تاریخی تناظر سے الگ کرکے صحیح طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔ مسیحی مغرب میں دو متحارب قوتیں تھیں، یعنی چرچ اور ریاست، پوپ اور قیصر، جو ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اکثر آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔
>
> اسلام کے مذہبی اور سیاسی نظام میں، نہ تو کوئی چرچ ہے، نہ کوئی پوپ اور نہ ہی کسی قیصر (Emperor) کی گنجائش ہے۔ پہلے چار خلفاءِ راشدین نہ بادشاہ تھے، نہ ہی سلطان۔ سیکولر کا متضاد لفظ Theocratic (پادرانہ)، Monastic (راہبانہ) اور Clerical ہے، چونکہ اسلام میں کوئی چرچ نہیں ہے، نہ ہی کوئی راہبانہ سلسلہ ہے، اس لئے 'اسلامک' اور 'سیکولر' ریاست، دونوں اپنے شہریوں کو مذہبی آزادی دیتی ہیں۔ انہیں انسانی حقوق، آزادی، قانون و انصاف کی نگاہ ہی مساوات کی ضمانت دیتی ہیں، سیکولر کا مطلب ہے: دنیاوی اور مادّی اور اسلام ایک جامع مذہب کی حیثیت سے چونکہ دنیاوی معاملات و مفادات کا احاطہ بھی کرتا ہے لہٰذا یہ ایک سول (Civil) اور سیکولر مذہب ہے''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام دُنیوی اور اُخروی زندگی دونوں کے معاملات کا اِحاطہ کرتا ہے،

اسلام میں دین و دنیا کی ثنویت نہیں ہے۔ اسلام جہاں اپنے پیروکاروں کو اُخروی زندگی کی تیاری کے لئے ہدایت کرتا ہے۔ وہاں انہیں یہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ ''اس دنیا میں سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو'' (القرآن) مگر سیکولرازم اور اسلام کی 'اپروچ' یکسر مختلف ہے۔ اسلام اُخروی و دنیوی زندگی میں توازن کا درس دیتا ہے، مگر سیکولرازم کے ہاں 'اخروی' معاملات کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے۔ وہاں تو مقصود و مطلوب محض دنیاوی لذائذ ہیں۔ دنیاوی لذتوں کی طرف یکطرفہ رجحان خودغرضی، حرص اور مادّہ پرستی کے جذبات پروان چڑھتا ہے۔ سیکولرازم میں دنیا سے شدید رغبت اور آخرت سے عدم رغبتی کا تصور ملتا ہے۔ اسی لئے اسلام اور سیکولرزم میں ایک جزوی مماثلت کے باوجود دونوں کے نظریۂ حیات میں بہت فرق ہے۔ لہٰذا اسلام کا سیکولرازم سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ ''دنیویت'' سیکولرازم جیسی وسیع اصطلاح کا محض ایک پہلو ہے۔ اس اصطلاح کا غالب پہلو وہ ہے جسے ''لادینیت'' کہا جاتا ہے۔ پروفیسر جمیل واسطی صاحب جیسے افراد کی عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی برتری ظاہر کرنے کی یہ کاوش جتنی بھی نیک نیتی پر مبنی ہو، مگر اس کے مضمرات نہایت خطرناک ہوں گے۔ پاکستان میں بعض اشتراکی مفکرین نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے ''اسلامک سوشلزم'' کی اصطلاح وضع کی۔ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان انہوں نے بہت سے مشترک پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی۔ ایک اور طبقہ جو یورپ کی جمہوریت سے بے حد متاثر ہے وہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان اسی طرح مشترکہ نکات کو بیان کرکے ''اسلامک ڈیموکریسی'' جیسی اصطلاح کو رواج دینے میں مصروف رہتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اسلام، اسلام ہی ہے۔ اسے کسی سابقے یا لاحقے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر بقول واسطی صاحب اسلام ایک سیکولر مذہب ہے۔ تو پھر سیکولرازم کے نفاذ کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے، سیدھے سبھاؤ اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس طرح کے التباس اور ابہام کو جان بوجھ کر کیوں پیدا کیا جاتا ہے۔

سیکولرزم کی مراد معین کرنے سے گریز

جناب تنویر قیصر شاہد اپنے مذکورہ کالم میں لکھتے ہیں:

''یہ ہماری کم علمی ہے یا حقیقت سے فرار کہ پاکستان میں سیکولرازم کے لفظ کی گالی تو آسانی سے دے دی جاتی ہے لیکن قانون یا پارلیمنٹ نے اس لفظ کی تشریح کی ہے، نہ اسے Define کیا ہے''

پاکستان کی پارلیمنٹ کی ''کوتاہیوں'' کا شمار کیا جائے تو ایک طویل فہرست مرتب ہوسکتی ہے، مگر موصوف کی اس ضمن میں خفگی بے جا ہے کیونکہ دنیا کی کسی پارلیمنٹ نے سیکولرازم کی تعریف کا تعین نہیں کیا، یہ کام وہاں کے ماہرین لسانیات اور دانشوروں نے انجام دیا ہے۔ پاکستان کے دانش باز سخن سازیاں تو بہت کرتے ہیں مگر 'سیکولرزم' کو اپنی خواہش کے مطابق Define نہیں کرتے، مزید برآں ایک 'سیکولر' آدمی کو 'لادین' کہنا اسی طرح گالی نہیں ہے جس طرح ایک طوائف کو بدکارہ کہنا اور ایک کرپٹ آدمی کو

حرام خور کہنا گالی نہیں ہے۔ یہ حقیقتِ حال کا اظہار ہے۔ جو لوگ اسلام کے مقابلے میں پاکستان میں سیکولرزم لانا چاہتے ہیں، انہیں مسلمان عوام کو اس قدر تو اظہارِ رائے کی آزادی دینی چاہئے کہ وہ انہیں 'لادین' کہہ سکیں۔ ظاہر ہے کہ وہ انہیں ملک بدر کرنے سے تو رہے۔ اگر ایک سوشلسٹ ریاست میں سوشلزم کے مخالفوں کو ملک بدر کرنا غلط نہیں سمجھا جاتا تو ایک خالص اسلامی ریاست میں اس کے نظریاتی مخالفوں کو ملک بدر کرنا بھی غلط نہیں سمجھا جانا چاہئے۔ مگر ہمارے سرخ جنت کے پجاری جو بات سوویت یونین کے ضمن میں درست سمجھتے تھے، وہ پاکستان کے بارے میں غلط سمجھتے ہیں!!!

آخر میں ہم بے حد زور دے کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سیکولرزم کا مطلب بلاشبہ اسلام دشمنی ہے۔ چونکہ پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام ہے، ان معنوں میں اس کا دوسرا مطلب پاکستان دشمنی بھی ہے۔ اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ اسلام ہی پاکستان کی اصل شناخت ہے، ورنہ اس کا وجود بے معنی ہے، اگر سیکولرازم کو ہی نافذ کرنا تھا تو پاکستان کے قیام کیلئے لاکھوں جانوں کی قربانی دینی کیا ضروری تھی؟

سیکولرزم: عیسائیت اور اسلام کے تناظر میں

آج کا ماڈرن، مغرب زدہ اور بزعم خویش لبرل مسلمان سیکولرازم کو جو بھی معنی پہنائے، اسلام اور سیکولرزم کے درمیان کسی قسم کی مطابقت پیدا کرنے کی کاوش صحرا میں سراب کو پانی سمجھ کر اپنے آپ کو ہلکان کرنے کے مترادف ہے۔ یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور سیکولرزم باہم مخالف اور متصادم نظام ہائے فکر ہیں، مگر وہ تلبیس کوشی کے پردے میں بات کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اگر اسلام کی کھل کر مخالفت کی تو عوام کے شدید عتاب کا انہیں سامنا کرنا پڑے گا اور مغربی جمہوریت نے انہیں کچھ اور بات ذہن نشین کرائی ہو یا نہیں، البتہ انہیں جمہوریت کے رَٹو طوطے ضرور بنا دیا ہے، وہ جمہوریت اور عوام کا راگ اَلاپتے رہتے ہیں۔ وہ عوام کو اپنے فکری اِلحاد میں رنگنا چاہتے ہیں، مگر اس باغیانہ تبلیغ کے لئے جو اخلاقی جراءت درکار ہے، اس سے ان کا دامن دِل تہی خاطر ہے۔

اسلام اور مغرب کے سیاسی تصورات کے درمیان اُصولی، کلیدی اور بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ اِسلام، چرچ اور ریاست یا زیادہ بہتر الفاظ میں دین وسیاست کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔ اسلام کے اندر پوپ اور قیصر کی تفریق نہیں ہے۔ خلفاءِ راشدین سے لے کر خاندانِ بنواُمیہ، خاندانِ بنوعباسیہ، عثمانی سلطنت و مابعد اِسلامی تاریخ کا کوئی بھی دور ایسا نہیں ہے جہاں پوپ اور قیصر یا کسی مذہبی پنڈت اور خلیفہ کے درمیان کوئی تصادم یا باقاعدہ محاذ آرائی کی صورت نظر آتی ہو۔ اسلامی تہذیب وتمدن کلیسا جیسے کڑی درجہ بندی پر مشتمل اِدارے کے وجود تک سے ناآشنا ہے۔ جبکہ مسیحی یورپ کی پوری تاریخ میں کلیسا نے اہم ترین ادارے کا کردار اُدا کیا ہے۔ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی کئی صدیاں تو ایسی ہیں کہ جس میں قیصر کا

اِقتدار تو برائے نام رہ گیا تھا، اصل اِقتدار کا مالک کلیسا یا پوپ ہی تھا۔ قیصر سیاسی حکمران ہونے کے باوجود عملاً پوپ کا ماتحت ہی تھا۔ پوپ کی خوشنودی کا حصول مسیحی حکمرانوں کے سیاسی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر تھا۔ مگر دوسری طرف اسلامی تاریخ کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ تعجب ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے متقی ترین اَفراد کو خلیفہ وقت کی طرف سے کوڑوں کی ذلت آمیز سزاؤں سے دوچار کیا جاتا ہے کہ انہوں نے خلیفہ کی طرف سے ملازمت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسے جلیل القدر ائمہ کرام نے اس ضمن میں عزیمت کی جو داستانیں رقم کی ہیں، اسلامی تاریخ ان پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ دوسری جانب کلیسا کی تاریخ کا ایک ایک ورق گواہی دے رہا ہے کہ پوپ اور اس کے حواری مجسٹریٹ جیسی معمولی آسامی کے لئے حکمرانِ وقت سے تصادم اور جنگ و جدل کرتے رہے ہیں۔

اسلام اور عیسائیت کے درمیان دوسرا اہم ترین فرق یہ ہے کہ عیسائیت میں تقویٰ اور تدین کی معراج یہ ہے کہ انسان دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے جنگل میں ڈیرے ڈال لے اور دنیاوی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ کلیسا کی اس غیر فطری روش کا نتیجہ ہی تھا کہ مسیحی پادریوں کے لئے عورت سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ مگر اسلام اپنے پیروکاروں کو دنیا میں رہتے ہوئے تزکیہ نفس اور پاکیزہ زندگی گزارنے کی ہدایت کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام، محسن انسانیت حضور اکرم ﷺ کا معروف ارشادِ گرامی ہے کہ:

''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے''

گذشتہ سطور میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغرب میں سیکولرزم کے نظریے کی ابتدا ہی اس تصور سے ہوئی کہ وہاں کے بعض مفکرین نے روحانی معاملات سے ہٹ کر دنیاوی معاملات کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ اسلام کے اندر نماز، روزے کی طرح اپنے بچوں کے لئے رزقِ حلال کی کوشش کو بھی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ کلیسا نے عورت کو چھونا حرام قرار دیا تھا مگر اسلام نے اپنی زوجہ سے صنفی مواصلت کو صدقہ اور باعثِ اجر قرار دیا، قرآنِ مجید میں واضح حکم دیا گیا ہے:

﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ یعنی ''دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو''

جہاں تک چرچ اور ریاست کے درمیان تفریق کی بات ہے، یہ تصور مغرب کے سیکولر دانشوروں کے ذہن کی تخلیق نہیں ہے۔ خود عیسائیت کی بنیادی تعلیمات میں دین و سیاست کی تفریق کی واضح تعلیم موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا اُسلوب اور منہج اَخلاقی ہے، اسی لئے انہوں نے برملا یہ اعلان کیا کہ وہ شریعتِ موسوی کی پابندی کرتے ہیں۔ شریعت یعنی نظامِ عمل یا طریقۂ کار کے بغیر ریاستی نظم ونسق نہیں چلایا جاسکتا۔ اَخلاقی تعلیمات کے مقابلے میں شریعت کی خصوصیت اس کا قانونی پہلو اور محکم ضابطوں کا وجود ہے۔ جسے معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کے لئے نافذ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نئی شریعت نہیں لائے تھے، اسی لئے انہوں نے حکومت کرنے کی خواہش کا

اِظہار یا جدوجہد کبھی نہیں کی۔ لیکن اسلام اور شارعِ اسلام کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ اسلام مجرد اَخلاقی تعلیمات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اسلام ہر اعتبار سے مکمل ضابطہ حیات ہے جو اِنسانی زندگی کے تمام پہلوؤں بالخصوص سیاسی پہلو کے متعلق واضح ہدایات دیتا ہے۔ اسلام کا نظامِ حیات ایک قوتِ نافذہ کا متقاضی ہے۔ اسلامی شریعت سماجی عدل کے قیام کے لئے اسلامی ریاست کے قیام کو ناگزیر سمجھتی ہے۔ انجیل میں واضح طور پر یہ الفاظ ملتے ہیں: ''جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب یہ جملہ اپنی روح کے اعتبار سے دین و دنیا کی اِسی تفریق کا اعلان ہے جو سیکولرازم کی اَساس ہے۔ یورپ کی موجودہ سلطنتیں اسی تصور پر قائم ہوئی ہیں۔ یہ تصور چونکہ عیسائیت اور سیکولرزم دونوں میں مشترک ہے لہٰذا مغرب میں اس نظریے کو جو والہانہ پذیرائی میسر آئی ہے وہ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سلطنت اور دین کی تفریق کا یہ نظریہ جدید سیکولر مغرب کا ''متفقہ مذہب'' ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مگر یہ تصور اسلام کے اَساسی نظریات کے صریحاً منافی ہے۔ سید سلیمان ندوی اسلام میں دین و دنیا کی وحدت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسلام دین و دنیا اور جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت لے کر اوّل ہی روز سے پیدا ہوا۔ اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علیٰ الاطلاق ہے جس کی حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ۔ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے، وہی زمین پر فرماں روا ہے'' (سیرت النبیؐ: جلد ہفتم، صفحہ نمبر ۴۵)

ایک اور مقام پر سید سلیمان ندوی اسی بات کو بے حد خوبصورت پیرائے میں بیان فرماتے ہیں:

''اسلامی سلطنت ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتا پا سلطنت ہے مگر سلطنتِ الٰہی کے اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں۔ اس میں ایک ہی حاکم اعلیٰ و آمر مانا گیا ہے۔ وہ حاکم علیٰ الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ آنحضرت اس دین کے سب سے آخری نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے۔ آپ کے احکام کی بجاآوری عین احکام خداوندی کی بجاآوری ہے۔ ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی'' النساء: آیت ۸ (ایضاً، ص ۱۱۰)

اسلامی تاریخ کا شاید ہی کوئی نامور مصنف ہو جس نے اسلام اور مسیحیت کے اس اُصولی فرق کی نشاندہی نہ کی ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''کسی بھی پیغمبر نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اس سے حاصل نہیں ہوتی کہ آدمی تمدن کے معاملاتی حصے میں بعض طبائع کی خودغرضی اور فساد سے بیزار ہو کر اس سے علیحدگی

اختیار کرلے۔ جنہوں نے لوگوں سے میل جول رکھنے اور خیر و شر میں ان کے شریک حال رہنے سے قطعاً علیحدگی اختیار کر کے پہاڑوں کی کھوؤں اور خانقاہوں کے تنگ و تاریک حجروں میں جا کر پناہ لی اور وحشیانہ زندگی بسر کرنا انہوں نے اختیار کرلیا، ان کی یہ ادا حق سبحانہ و تعالیٰ کے ہاں ہرگز پسندیدہ نہیں"

جدید اسلامی دنیا کے نامور مفکر، مصر کے علامہ یوسف القرضاوی سیکولرزم اور اسلام کا موازنہ کرتے ہوئے نہایت بلیغ اور مؤثر پیرائے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اسلام میں سرے سے انسانی زندگی کے معاملات کی یہ تقسیم ہی نہیں کہ زندگی کے یہ اُمور دینی ہیں اور یہ غیر دینی۔ دین و دنیا کی تقسیم ہی غیر اسلامی، اور مسیحی مغرب سے درآمد شدہ ہے اور جو ہمارے معاشرے میں بعض اداروں اور لوگوں کے بارے میں دینی اور غیر دینی (سیکولر) کے اَلفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس تقسیم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے..... اسلامی نظامِ حیات میں زندگی کے یہ دو حصے کبھی نہیں رہے اور دین و دنیا کی تفریق کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اسلام اس دین سے آشنا نہیں جو سیاست سے عاری ہو اور اس سیاست کو تسلیم نہیں کرتا جو دین سے خالی ہو۔ اسلام میں انسانی زندگی کے تمام پہلو اس طرح باہم مربوط اور دوش بدوش رہے ہیں جس طرح جسم و جان کا رشتہ باہم مربوط ہے۔ اس لئے اسلام کی نظر میں دین اور علم، دین اور دنیا، دین اور حکومت، ہر رشتہ مربوط، غیر منفصل اور کبھی نہ جدا ہونے والا ہے" ("سیکولرازم اور اسلام" صفحہ ۵۳، اُردو ترجمہ: ساجد الرحمٰن صدیقی)

یورپ کی جدید تہذیب عدم توازن کا شکار ہے۔ قدیم یورپ ایک انتہا پر تھا تو جدید یورپ ایک دوسری انتہا پر پہنچ گیا ہے۔ قدیم یورپ میں عورت کو پاپ کی گھڑی کا عظیم خلوق سمجھا جاتا تھا، اسے جائیداد میں سرے سے کوئی شراکت حاصل نہ تھی۔ اس کا اپنا کوئی تشخص نہ تھا، مگر جدید یورپ میں عورت کو اس قدر آزادی دی گئی ہے کہ عملاً وہ کوئی بھی پابندی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ عورتوں کی ہم جنس پرستی اور اسقاطِ حمل کے حق کو حال ہی میں اقوام متحدہ کی بیجنگ پلس فائیو کانفرنس میں "بنیادی انسانی حقوق" کے طور پر اَقوامِ عالم سے تسلیم کرانے کی کوشش کی گئی۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں فرد کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔ حکمرانوں کو خدائی حقوق کے نام پر جابرانہ اختیارات حاصل تھے، آج فرد کی آزادیوں کے مقابلے میں معاشرے کے حقوق نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قدیم یورپ میں جائیداد کی ملکیت پر غاصبانہ قبضہ کی صورت میں جاگیرداری نظام رائج تھا، اس کے ردِعمل میں جب اشتراکیت کا نظام سامنے لایا گیا تو اس میں ذاتی جائیداد کے حق کا سرے سے ہی انکار کر دیا گیا۔ قدیم یورپ میں کلیسا کو اس قدر اختیارات حاصل تھے کہ اُمورِ ریاست کا کوئی بھی معاملہ کلیسا کی رضا جوئی کے بغیر جائز تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ کلیسا جیسے چاہتا تھا جائز قرار دیتا اور جسے چاہتا ناجائز اور کافرانہ قرار دے کر مسترد کر دیتا۔ جدید یورپ سیکولرزم کا حامی ہے جس میں مذہب کو کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ سیکولرزم کے تصور سے پہلے دنیاوی زندگی سے متمتع ہونا

ایک گناہ کی بات تصور کی جاتی تھی۔ معمولی نعمتوں سے بہرہ ور ہونا بھی عاصیانہ عیش پرستی کے زمرے میں شمار ہوتا تھا، مگر اس کا ردّعمل یہ ہے کہ آج کا سیکولر یورپ اُخروی زندگی کے تصور سے ہی بیزار ہے۔ آج کا مغربی انسان اس دنیا کی لذتوں سے حریصانہ طور پر لذت اندوز ہونے کو ہی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہے۔ گویا پہلے اگر دنیاوی معاملات کے متعلق تفریط تھی تو آج اِفراط کی اجارہ داری ہے۔

اسلامی نظام میں دین و دنیا کے درمیان حسن توازن قائم کیا گیا ہے۔ اسلام دنیا سے مکمل بے رغبتی کا پرچار نہیں کرتا اور نہ ہی دنیاوی لذتوں میں غرق ہو کر اُخروی زندگی کو یکسر بھلا دینے کو قابل تحسین سمجھتا ہے۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے مضمون نگار کے مطابق

''قرآنِ مجید میں دنیا کا لفظ ایک سو پندرہ مرتبہ آیا ہے اور اکثر آخرت کے مقابلے پر آیا ہے۔ قرآن کی رو سے دنیا اور آخرت دونوں کائنات کی حقیقت میں شامل ہیں اور ایک مؤمن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان دونوں کی فلاح و سعادت کے لئے کوشاں ہو، خدا پرستی اور دین داری، دنیوی معیشت اور ترقی کے خلاف نہیں، اسی لئے ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً﴾ ''یعنی اے ربّ! ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا فرما'' (البقرۃ:۲۰۱) کی دعا سکھائی گئی ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں کی بہتری کے حصول کی اِلتجا کی گئی ہے۔ قرآنِ مجید میں حج کے اَحکام کے سلسلے میں حکم ہوا: ''اس میں تمہارے لئے کوئی گناہ نہیں کہ (اعمالِ حج کے ساتھ) تم اپنے پروردگار کے فضل کی تلاش میں بھی رہو۔ البتہ ایسا نہ کرنا چاہئے کہ کاروبارِ دنیوی کے انہماک کی وجہ سے حج کے اوقات و اَعمال سے بے پروا ہو جاؤ'' (البقرۃ:۱۹۸)۔ لیکن اسلام میں اس امر کی ممانعت ہے کہ صرف دنیا کو عین مقصود سمجھ لیا جائے اور آخرت کا انکار یا اس سے قطع نظر ہو جائے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ خداوندی ہے: ''کیا تم آخرت کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کو پسند کرنے لگے ہو'' (التوبہ:۳۲)

ان ارشاداتِ ربّانی سے معلوم ہوا کہ دین اسلام دنیا کا مخالف نہیں بلکہ اس دنیا پرستی کا مخالف ہے جو انسان کو خدا پرستی، نیکی اور جزا و سزا کے عقیدے سے غافل کر دیتی ہے۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں زُہد و تصوف کے کچھ مسالک ظہور میں آئے، جن کے زیر اثر ترکِ دنیا اور ترکِ سعی کی تلقین ہوئی، لیکن یہ انتہا پسند صوفیوں اور زاہدوں کا مسلک تھا۔ جن معتدل صوفیا کی نظر روحِ شریعت پر رہی، انہوں نے بری دنیا داری سے بچنے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ کسبِ معاش اور سعی و عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔ جمہور اکابر علماء اور حکماءِ اسلام نے زندگی کو ایک معرکۂ عمل قرار دیا ہے اور اس سے فرار کا سبق نہیں سکھایا۔ علامہ ابن خلدون نے اپنے 'مقدمہ' میں دنیا کو آخرت کی تجربہ گاہ قرار دے کر اس میں حسن زندگی کو انسان کا فطری تقاضا اور اس کا کمال ظاہر کیا ہے۔ مفکر اسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے دنیوی زندگی کو آخرت سے وابستہ کرنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اعمالِ انسانی کے لئے ایک ایسا اَخلاقی معیار مہیا ہو جائے جو مثالی ہو۔ ابن مسکویہ اور امام غزالی نے سعادت کو دُنیوی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ (باقی آئندہ)